Digitized by Khilafat Library Rabwah

روزنامہ
الفضل
ربوہ
ایڈیٹر: نسیم سیفی
فون ۲۲۹
رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۵۴
جلد ۴۱/۷۶ | اتوار ۲ صفر ۱۴۱۲ھ، ۱۸ ظہور ۱۳۷۰ہش، ۱۸ اگست ۱۹۹۱ء | نمبر ۱۸۳

روحانی نجات کی دعا مانگنی چاہیئے

(حضرت لوط کی دعا "مجھے اور میرے اہل کو نجات بخش" کے بارے میں فرمایا)

"نجات (کی دعا) صرف ظاہری نجات کی دعا نہیں ہوتی بلکہ بدیوں سے روحانی نجات بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو روحانی نجات حاصل کرتا ہے اس کے لئے بدنی نجات خود بخود عطا ہو جاتی ہے۔ پس حضرت لوطؑ اگر صرف بدنی نجات مانگتے تو اس کے اندر روحانی نجات شامل نہیں تھی مگر جب روحانی نجات مانگی تو اس میں بدنی نجات شامل ہو گئی۔"

(ارشاد سیدنا حضرت امام جماعت احمدیہ (الرابع) ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز)

احمدی احباب کی تربیت کے لئے

ارشادات حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ

"دوسرا یہ کہ انعام حلال اور حرام میں تمیز نہیں کرتے۔ ایک بیل بھی بے تمیز نہیں کرتا کہ یہ ہمسایہ کا کھیت ہے اس میں نہ جاؤں۔ ایسا ہی ہر ایک امر جو کھانے کے لحاظ سے ہو۔ نہیں کرتا۔ کتّے کو ناپاکی، پاکی کے متعلق کوئی لحاظ نہیں اور پھر چارپایہ کو اعتدال نہیں۔

یہ لوگ جو اخلاقی اصولوں کو توڑتے ہیں اور پرواہ نہیں کرتے کہ گویا انسان نہیں۔ پاک پلید کا تو یہ حال، عرب میں مُردے کتّے کھا لیتے تھے۔ اب تک اکثر ممالک میں یہ حال ہے کہ چوہوں اور کتّوں اور بلّیوں کو بڑے لذیذ کھانے سمجھ کر کھایا جاتا ہے۔ چوہڑے چمار مردار خور قومیں یہاں بھی موجود ہیں۔

پھر یتیموں کا مال کھانے میں کوئی تردّد نامّل نہیں۔ جیسے یتیم کا گھاس گائے کے سامنے رکھ دیا جاوے۔ بلا تردّد کھا لے گی۔ ایسا ہی ان لوگوں کا حال ہے۔ یہی معنے ہیں .... (محمّد: ۱۳) ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔

غرض یاد رکھو کہ دو پہلو ہیں۔ ایک عظمتِ الٰہی کا جو اس کے خلاف ہے، وہ بھی اخلاق کے خلاف ہے اور دوسرا شفقت علیٰ خلق اللہ کا۔ پس جو نوعِ انسان کے خلاف ہو وہ بھی اخلاق کے برخلاف ہے۔ آہ! بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان باتوں پر جو انسان کی زندگی کا اصل مقصد اور غرض ہیں، غور کرتے ہیں۔"

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۳۵۶)

ربوہ ۱۶ اگست: آج یہاں بیت الاقصیٰ میں نماز جمعہ محترم مولانا سلطان محمود انور صاحب ناظر اصلاح وارشاد نے پڑھائی اور خطبہ جمعہ میں سیدنا حضرت امام جماعت احمدیہ (الرابع) ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کا خطبہ فرمودہ ۱۲۔ جولائی ۱۹۹۱ء بمقام بیت الفضل لندن پڑھ کر سنایا۔

اس خطبہ میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی دعاؤں کا موضوع جاری رکھا۔ اور فرمایا کہ اپنی کمزوریاں اور کجیاں دور کرنے کی دعا سب سے مشکل ہے اور یہی دعا سب سے ضروری ہے۔ حضور نے فرمایا کہ قرآن کریم میں بعض مضامین بار بار دوہرائے گئے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ہر بار ان مضامین میں نیا پہلو اور نیا انداز بیان کیا جاتا ہے۔ اور ہر بار نیا مضمون سامنے آتا ہے۔ حضور نے اس خطبے میں یہ بھی فرمایا کہ ۳۰ جون کو ختم ہونے والے مالی سال میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عالمی سطح پر مجوزہ بجٹ سے کئی لاکھ روپے زائد عطا فرما دیئے ہیں۔ حضور کا یہ خطبہ جن دو نئے ممالک نے براہ راست سنا وہ نیوزی لینڈ اور تنزانیہ ہیں۔

سانحۂ ارتحال

مکرم مبشر لطیف احمد صاحب ایڈووکیٹ فیصل ٹاؤن لاہور اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے والد مکرم شیخ امیر احمد صاحب آف بھیرہ ہارٹ اٹیک کے بعد مورخہ ۱۲ اگست رات ساڑھے گیارہ بجے لاہور میں وفات پا گئے۔ ان کی میت ربوہ لائی گئی اور ۱۳ اگست کو بعد نماز عصر بیت المبارک میں مکرم مولانا دوست محمد صاحب شاہد نے نماز جنازہ پڑھائی اور بہشتی مقبرہ میں تدفین کے بعد دعا بھی کروائی۔

احباب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ موصوف کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

فرمانبرداری ہر ایک کامیابی اور ترقی کا چشمہ ہے

اقتباس از خطبہ فرمودہ سیدنا حضرت امام جماعت احمدیہ (الاوّل) اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو

ابراہیم علیہ السلام نے اولاد کو بھی یہی سکھایا کہ جب تک خدا تعالیٰ حکم دے تب تک ہی تم اس کی اطاعت کرتے رہو۔ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے کلام کے منکر ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے کرنا تھا کر چکا۔ اس مقام پر سوچیں کہ اگر یہ سلسلہ بند ہو چکا تھا اور ابراہیم علیہ السلام کے بعد اور کوئی احکام ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے نازل نہ ہونے تھے تو پھر اسلم کی آواز کی اطاعت کے لئے کیوں ابراہیم نے اولاد کو تاکید کی۔ پھر صرف ابراہیم ہی نہیں بلکہ اس کا پوتا حضرت یعقوب بھی اپنی اولاد کو یہی حکم دیتا ہے ... کہ اے میری اولاد تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ دین (ابراہیمی) پسند فرمایا ہے کہ تم ہر وقت خدا کی فرمانبرداری میں رہو۔ حتیٰ کہ تمہاری موت بھی اسی فرماں برداری میں ہو۔ یہ فرماں برداری جو کہ ہر ایک کامیابی اور ترقی کا چشمہ ہے انسان اس سے کس طرح محروم رہ جاتا ہے۔ اس کا باعث قرآن شریف میں تاریخی واقعات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے پہلا نافرمان جس کی تاریخ ہمیں معلوم ہے ابلیس ہے وہ کیوں نافرمان بن گیا۔ اس کی خبر بھی قرآن کریم

باقی صٹ پر

Digitized by Khilafat Library Rabwah

روزنامہ الفضل ربوہ
پبلشر: آغا سیف اللہ۔ پرنٹر: قاضی منیر احمد
مطبع: ضیاء الاسلام پریس۔ ربوہ
مقام اشاعت: دارالنصر غربی۔ ربوہ
قیمت

۱۸؍ظہور ۱۳۷۰ہش ۱۸؍اگست ۱۹۹۱ء

دین اور دُنیا

حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ ــ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ پر سلامتی نازل فرماتا رہے فرماتے ہیں:-

"فطرت اور عقلی حالت اور جذبات کی حالت میں اعلیٰ درجہ کی صفائی حاصل ہو جاوے تو کچھ بات ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ دُنیا کے اشغال چھوڑ دو۔ خدا تعالیٰ نے دُنیا کے شغلوں کو جائز رکھا ہے کیونکہ اس راہ سے بھی ابتلاء آتا ہے اور اس ابتلاء کی وجہ سے انسان چور، قمار باز، ٹھگ، ڈکیت بن جاتا ہے اور کیا کیا بری عادتیں اختیار کر لیتا ہے۔ مگر ہر ایک چیز کی ایک حد ہوتی ہے دنیوی شغلوں کو اس حد تک اختیار کرو کہ وہ دین کی راہ میں تمہارے لئے مدد کا سامان پیدا کریں اور مقصود بالذات اس میں دین ہی ہو۔"

حضرت اقدس کے اس ارشاد سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ دنیوی اشغال بھی جاری رہیں اور دینی بھی۔ لیکن دنیوی اشغال کی صورت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ دین کے کاموں میں ممد ثابت ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مقصد تو دین ہی ہے اس لئے دین ہی کی راہ خدا سے ملنے کی راہ ہے لیکن دُنیا سے بھی انسان اپنے آپ کو منقطع کر کے دین کی راہ نہیں اپنا سکتا۔ بہتر بات یہ ہے کہ دُنیا کو اس طرح حاصل کرے اور اس اس طرح متمتع ہو کہ دین کے کاموں میں نہ کوئی حرج واقع نہ ہو بلکہ دین کے کام بہتر سے بہتر طریق پر جاری رہ سکیں۔ یعنی وہ دنیوی اشغال دین ہی کی مدد کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ اپنے دین پر گامزن ہوتے ہوئے اپنے نفس کا بھی حق ادا کریں۔ اور اس طرح نفس کا حق ادا کرنا ایک طرح سے دین ہی کا حصہ بن جاتا ہے۔

اگر انسان دین کو چھوڑ کر دنیا ہی کی طرف لگ جائے تو یہ بات بھی ناقابلِ قبول اور اگر اپنی سمجھ کے مطابق دُنیا ہی کے ہو کر رہ جائے اور اپنے حقوق اور اپنے رشتہ داروں کے حقوق کی پرواہ نہ کرے تو یہ بات بھی ناقابلِ قبول۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا ہونے چاہئیں اور انسانوں کے حقوق بھی تلف نہیں کرنے چاہئیں۔ یہی درمیانی راستہ ہے اور اس درمیانی راستہ پر چل کر ہی ہم کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ پس دُنیا کے کام بھی کریں لیکن انہیں بھی دین ہی کا حصہ بنا دیں۔

شرارت کے کاندھے شرافت کی میّت
کہاں اس کو دفنائیں گے کون جانے
زمانے کے ہونٹ اس طرح سِل گئے ہیں
انہیں کون کھلوائیں گے کون جانے
ــــ ابوالاقبال

کرم سے اپنے عطا کر ہمیں وہ عزمِ جلیل
کہ نفرتوں کو محبت میں کر سکیں تبدیل

عناد و بغض و کدورت مٹا کے دُنیا سے
جلائیں علم و ہنر کی جہان میں قندیل

خزاں و گرد کے طوفان، آندھیوں کے ہجوم
یہ انقلابِ بہاراں کے قرب کی ہے دلیل

کبھی جو حق سے نبرد آزما ہُوا باطل
کثیر پر رہے غالب و فتح مند قلیل

وہ تاجدارِ رسلؐ، شاہکارِ ربِّ قدیر
خدا کے دین کی جس ہاتھ پر ہوئی تکمیل

اسی نے ہم کو دکھایا ہے راستہ سیدھا
وہی ہے عقدہ کشا اور کارساز و وکیل

خدائے پاک سمیع و مجیب اور کریم
گدائے رحمتِ باری محمد اسماعیل

محمد اسمٰعیل نادر قریشی

پردہ کی اہمیت

حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں

"آج کل پردہ پر حملے کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ پردہ سے مراد زندان نہیں بلکہ ایک قسم کی روک ہے۔ کہ غیر مرد اور عورت ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ جب پردہ ہوگا ٹھوکر سے بچیں گے۔ ایک منصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ ایسے لوگوں میں جہاں غیر مرد و عورت اکٹھے بلا تامل اور بے محابا مل سکیں۔ سیر کریں۔ کیونکر جذباتِ نفس سے اضطراراً ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ بسا اوقات سننے اور دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی قومیں غیر مرد اور عورت کے ایک مکان میں تنہا رہنے کو حالانکہ دروازہ بھی بند ہو کوئی عیب نہیں سمجھتیں۔ یہ گویا تہذیب ہے۔ انہی بد نتائج کو روکنے کیلئے... وہ باتیں کرنے کی اجازت ہی نہ دی جو کسی کی ٹھوکر کا باعث ہوں۔ ایسے موقعہ پر کہہ دیا کہ جہاں اس طرح غیر محرم مرد و عورت ہر دو جمع ہوں تیسرا ان میں شیطان ہوتا ہے۔ ان ناپاک نتائج پر غور کرو جو یورپ اس خلیع الرسن تعلیم سے بھگت رہا ہے۔"

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء)

Digitized by Khilafat Library Rabwah

ارشادات سیدنا حضرت فضل عمر (اللہ تعالیٰ آپ سے ہمیشہ راضی رہے)

علمی مسائل

فرماتا ہے۔ تم یہ بھی تو دیکھو کہ مصیبت زدہ انسان کی دعاؤں کو کون قبول کرتا ہے اور کون اسکی مصیبتوں کو دور کرتا ہے۔ اور کون تم کو زمین کا وارث بناتا ہے۔ کیا ایسی صفات حسنہ رکھنے والے خدا کا کوئی ہمسر تمہیں نظر آتا ہے؟ مگر افسوس کہ تم لوگ قطعاً نصیحت حاصل نہیں کرتے

یہاں جو "مضطر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا شخص مراد ہے جو اپنے چاروں طرف مشکلات ہی مشکلات دیکھتا ہے اور اسے اپنی کامیابی کا کوئی مادی راستہ نظر نہیں آتا۔ صرف ایک جہت اللہ تعالیٰ والی باقی رہ جاتی ہے۔ اور اسی پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ گویا مضطر کے صرف یہی معنے نہیں کہ اس کے دل میں گھبراہٹ ہو۔ کیونکہ گھبراہٹ میں بعض دفعہ ایک شخص بے تحاشہ کسی طرف چل پڑتا ہے۔ بغیر اس یقین کے جسطرف وہ جارہا ہے وہاں اسے امن بھی حاصل ہوگا یا نہیں بلکہ بعض لوگ گھبراہٹ میں ایسی طرف چلے جاتے ہیں جہاں جہاں خود خطرہ موجود ہوتا ہے۔ اور وہ اس سے نہیں بچ سکتے۔ پس بعض اضطراب کا دل میں پیدا ہونا اضطرار پر دلالت نہیں کرتا۔ اضطرار پر وہ حالت دلالت کیا کرتی ہے۔ جب چاروں طرف کوئی پناہ کی جگہ انسان کو نظر نہ آتی ہو اور ایک طرف نظر آتی ہو۔ گویا اضطرار کی نہ صرف یہ علامت ہے کہ چاروں طرف آگ نظر آتی ہو بلکہ یہ بھی علامت ہے کہ ایک طرف امن نظر آتا ہو اور انسان کہہ سکتا ہو کہ وہاں آگ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی دعا خدا تعالیٰ کے حضور قبول کی جاتی ہے جس کے کرتے وقت بندہ اس رنگ میں اس کے سامنے حاضر ہوتا ہے کہ اسے یہ یقین کامل ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے میرے لئے اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔ یہی وہ مضطر کی حالت ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اے خدا تیرے عذاب اور تیری طرف سے آنے والے ابتلاؤں سے کوئی پناہ کی جگہ نہیں سوائے اس کے کہ میں سب طرف سے مایوس ہو کر اور آنکھیں بند کر کے تیری طرف آجاؤں۔ کوئی پناہ نہ ہونے والی جو حالت ہے یہی اضطراب کی کیفیت ہے۔ اور جب خدا تعالیٰ نے اس میں یہ کہا کہ کون ہے۔ جو اضطرار والے کی دعا کو سنتا ہے۔ جب وہ دعا کرتا ہے تو اسکے معنے یہ ہوئے کہ ایسے شخص کی دعا جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ملجاو ماویٰ نہیں سمجھتا اور اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا کسی کو منجاء قرار نہیں دیتا ضرور سنی جاتی ہے۔ اور یہ شرط بلاوجہ نہیں رکھی گئی کہ گو حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی ہر مضطر کا علاج ہے۔ مگر بعض دفعہ اس کے دیئے ہوئے انعام کے ماتحت کوئی بندہ بھی دوسرے کے اضطرار کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ ایک آدمی سخت غریب ہوتا ہے اسکے کپڑے پھٹ جاتے ہیں اور اسے نظر نہیں آتا کہ وہ نئے کپڑے کہاں سے بنوائے کہ اچانک ایک امیر آدمی جو بعض دفعہ ہندو ہوتا ہے۔ بعض دفعہ سکھ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ پارسی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ جینی یا بت پرست ہوتا ہے۔ اسے دیکھتا ہے اور کہتا ہے تمہارے کپڑے پھٹ گئے ہیں آؤ میں تمہیں نیا جوڑا بنوا دوں۔ اب گو ہمارے یقین کے مطابق خدا تعالیٰ نے ہی اس امیر آدمی کے دل میں تحریک پیدا کی کہ وہ اسے کپڑے بنوا دے مگر جو کامل الایمان نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہے کہ میری اضطرار کی حالت میں فلاں آدمی میرے کام آیا ہے مگر وہی آدمی جس نے اسے کپڑوں کا جوڑا بنا کر دیا تھا جب یہ ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسکے لئے کھانا اور پینا حرام ہو جاتا ہے۔ پانی تک اسے ہضم نہیں ہوتا۔ تمام جسم کی حالت خراب ہو جاتی ہے چل پھر بھی نہیں سکتا تو ایسی حالت میں وہ امیر آدمی اسکی مدد نہیں کر سکتا۔ بلکہ اگر کوئی اچھا لائق اور رحمدل طبیب ہوتا ہے اور وہ اسے اس حالت میں دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے تمہیں علاج پر روپیہ خرچ کرنے کی توفیق نہیں۔ تو میں تمہیں مفت دوائی دینے کے لئے تیار ہوں۔ تم میرے پاس رہو اور اپنے مرض کا علاج کرو۔ اب ایسی اضطرار کی حالت میں امیر اس کے کام نہیں آیا بلکہ طبیب اسکے کام آیا۔ جب وہ کپڑوں کے لئے مضطر تھا تو امیر آدمی اسکے کام آگیا۔ مگر جب وہ علاج کے لئے مضطر ہوا تو ایک طبیب اسکے کام آگیا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس پر کوئی مقدمہ بن جاتا ہے۔ وہ بے گناہ ہوتا ہے۔ اس کا دشمن زبردست ہوتا ہے۔ اور وہ کسی وجہ سے ناراض ہو کر اسے کسی مقدمہ میں ماخوذ کرا کے عدالت تک پہنچا دیتا ہے۔ اب اسے نہ وکیل کرنے کی توفیق ہے۔ اور نہ اس میں خود مقدمہ لڑنے کی قابلیت ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ کیا کرے۔ آخر کوئی رحمدل وکیل اسے مل جاتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے میں بغیر فیس کے تمہاری وکالت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اب ایسے موقعہ پر نہ امیر اسکے کام آسکا۔ نہ طبیب اسکی مشکل دور کر سکا۔ صرف وکیل اس کے کام آیا۔ اسی طرح ایک اور وقت میں یہ مضطر ہوتا ہے۔ بوجھ اٹھائے لئے جارہا ہوتا ہے کہ تھک کر چور چور ہو جاتا ہے۔ اور بوجھ اس سے گر جاتا ہے اسمیں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس بوجھ کو پھر اٹھا سکے اب ایسے وقت میں نہ امیر اسکے کام آسکتا ہے۔ نہ طبیب اسکے کام آسکتا ہے۔ نہ وکیل اسکے کام آسکتا ہے۔ البتہ کوئی مضبوط زمیندار چلتے ہوئے اسے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تو یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے۔ بوجھ مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا۔ اس پر وہ زمیندار اسکا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ اب یہ مضطر تو تھا۔ مگر اس حالت میں نہ امیر اسکے کام آسکا۔ نہ طبیب اس کے کام آسکا۔ نہ وکیل اسکے کام آسکا۔ بلکہ اس کا ایک زمیندار بھائی اسکے کام آگیا۔ تو ایک ہی انسان کے مختلف اضطراروں میں مختلف لوگ اسکے کام آسکتے ہیں۔ مطلق مضطر جسکے لئے کوئی شرط نہیں کہ وہ کس قسم کا مضطر ہو۔ خواہ وہ بھوکا ہو۔ ننگا ہو۔ پیاسا ہو۔ بیمار ہو۔ بوجھ اٹھائے جارہا ہو۔ کسی قسم کا اضطرار ہو اسکی ساری ضرورتوں کو پورا کرنے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پھٹے پرانے کپڑے ہوں۔ تو کوئی امیر اسکے کام آجائے۔ مگر طبیب اس کے کام نہیں آسکتا۔ کوئی بیمار ہو تو طبیب اسکے کام آجاتا ہے مگر وکیل اسکے کام نہیں آسکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بے گناہ کسی مقدمہ میں مبتلا ہو تو وکیل اسکے کام آجائے۔ مگر بوجھ اٹھانے کے وقت وکیل اسکے کام نہیں آسکتا ہو سکتا ہے بوجھ اٹھانے کے وقت ایک زمیندار اسکے کام آجائے۔ لیکن امیر طبیب اور وکیل اسکے کام نہیں آسکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ یہ سارے کام کر سکتا ہے باقی انسان جس قدر ہیں وہ تو کسی ضرورت میں کام آسکتے ہیں۔ کوئی ایک قسم کے مضطر کے کام آسکتا ہے۔ کوئی دوسرے قسم کے مضطر کے کام آسکتا ہے۔ مگر ہر قسم کے مضطرین کی ضرورتیں پوری کرنے والی خدا کی ہی ذات ہوتی ہے۔ اور انسان کے اضطرار کی ہزاروں حالتیں ہوتی ہیں بھلا ان حالتوں میں کوئی بندہ کسی کے کب کام آسکتا ہے۔ ان حالتوں میں تو کوئی بادشاہ بھی کسی کے کام نہیں آسکتا فرض کرو ایک شخص سخت بیمار ہے۔ اب بادشاہ کا خزانہ اسکے کام نہیں آسکتا۔ بادشاہ کی فوجیں اسکے کام نہیں آسکتیں۔ بادشاہ کا قرب اسکے کام نہیں آسکتا۔ اسکے کام تو اللہ تعالیٰ ہی آسکتا ہے جو ہر قسم کی بیماریوں کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یا ایک جنگل میں گذرنے والا شخص جس پر بھیڑیا یا شیر اچانک جھپٹ کر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ بادشاہ کا چاہے کتنا ہی منہ چڑھا ہو یا بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو بادشاہ اسکے کیا کام آسکتا ہے یا طبیب جو اس کا علاج کرتا تھا۔ وہ اس کے کیا کام آسکتا ہے یا امیر جو نئے کپڑے سلا دیتا تھا وہ اسکے کیا کام آسکتا ہے۔ یا وکیل جس نے رحم کرکے اس کا مقدمہ لے لیا تھا۔ اس کے کس کام آسکتا ہے جنگل میں وہ تن تنہا جارہا ہوتا ہے۔ کہ شیر چیتا یا بھیڑیا اسکے سامنے آجاتا ہے ایسی حالت میں وہاں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو کام آتی ہے۔ کوئی انسان کام نہیں آسکتا۔ تو جب تک انسان کے اندر یہ یقین پیدا نہ ہو کہ ہر قسم کے اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کام آتا ہے۔ اسوقت تک وہ مضطر نہیں کہلا سکتا مگر بہرحال جب وہ مضطر ہونے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو خدا اس کے پاس دوڑتے ہوئے آجاتا ہے۔ اور اسکی ہر تکلیف اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔ دنیا میں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ لوگ اگر دوسروں کے خلاف فریاد کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ افسر اُن سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے ہمارے خلاف شکایت کی تو ہم تمہاری زبان گدی سے کھینچ لیں گے۔ وہ ڈرتا ہے کہ اگر میں نے فریاد کی تو بعد میں وہی افسر مجھے اور رنگ میں مبتلا کر دیں گے۔ مگر یہاں یہ حالت

باقی ص ۵

Digitized by Khilafat Library Rabwah

پروفیسر میاں محمد افضل

ہمارا تعلیمی معیار

استاذی المکرم میاں محمد ابراہیم صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس طرف توجہ دلائی کہ ہمارا تعلیمی معیار بہت گر چکا ہے اب طالب علموں میں علم کی وہ چکا چوند دکھائی نہیں دیتی جو کہ پہلے نظر آتی تھی۔ یہ بالکل بجا۔ ہر طرف گراوٹ بربادی۔ تنزل کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن نئی پود یہ بھی کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ یہ رائے پرانی نسل کی ہے اور ہم کسی سے کم نہیں بلکہ ہمارے علم میں زیادہ وسعت ہے۔ گویا یہ مسئلہ بھی نئی۔ پرانی نسل کے مختلف یا متضاد نظریات کے نذر ہو جاتا ہے۔ آئیے اس کا جائزہ لیں:

پہلی بات تو یہ کہ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ تعلیمی معیار کیا ہے۔ کیا ہمیں قابلیت کو کسی کے انگریزی پڑھ لکھ لینے کی صلاحیت سے جانچنا ہے اور کیا وہ شخص جو اچھی انگریزی جانتا ہے دوسرے سے جو کم جانتا ہے بہتر ہے۔ ہمارا ایک موقف یہ ہے۔ پہلے وقتوں کے لوگ ہوتے تو میٹرک پاس تھے مگر دفتروں میں اتنی اچھی انگریزی لکھتے کہ بعض اوقات ان کے انگریز حاکم بھی اُن کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آج انگریزی کا یہ عالم ہے کہ ایک بی۔اے پاس بھی بعض اوقات ایک معمولی درخواست بھی صحیح طور پر نہیں لکھ پاتا۔ بلکہ دیکھا گیا ہے کہ وہ صاحبان بھی جو کالج میں پروفیسر ہیں ایک معمولی درخواست لکھتے ہوئے غلطیاں کر جاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کو ایم۔اے کرنے کے بعد لفظ پرنسپل کا سپیلنگ نہیں آتا تھا۔ یہ آثار ہیں گرتے ہوئے تعلیمی معیار کے۔ لیکن کیا تعلیمی معیار کو ناپنے کا پیمانہ محض انگریزی دانی ہونا چاہیئے یا کچھ اور بھی۔ اب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ آج کے بچے بچپن میں بھی اتنا کچھ جان جاتے ہیں کہ ہم پرانی نسل کے لوگوں کو اپنے بچپن سے موازنہ کر کے حیرت ہوتی ہے۔ وجہ اس کی ہے وہ قرآنی پیشگوئی یعنی "جب کتابیں پھیلا دی جائیں گی" یعنی علم میں بے حد و حساب وسعت پیدا ہو جائے گی۔ اس قرآنی پیشگوئی کا پورا ہونا دھڑا دھڑ چلتے ہوئے پریسوں کے علاوہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ بھی ہے۔ آج ٹیلی ویژن ہر گھر میں براجمان ہے۔ وہ کانوں اور آنکھوں کے ذریعہ اتنا علم پہنچا رہا ہے کہ پہلے ایسی باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بچوں کو جہاں دوسرے ملکوں کی سیر کا موقعہ مل رہا ہے (بذریعہ ٹی۔وی) وہاں انہیں بعض سائنسی حقائق سے بھی آگاہی ہو رہی ہے۔ تاریخی معلومات بھی بہم پہنچ رہی ہیں ایک چھوٹی سی مثال آج چھوٹے چھوٹے بچے جانتے ہیں کہ ڈائنوسار کیا ہیں۔ اُن کی شکل کیا تھی۔ کب ہوتے تھے اور آیا آج کل کہیں ہیں یا نہیں۔ پھر یہ کہ جب سورج کو گرہن لگا تو ہوائی میں اس کی شکل کیسی دکھائی دے رہی تھی یا ورزش کرنے سے پہلے وارم اپ (WARM UP) کیوں ضروری ہے۔ یا جاپان کی تیز ترین گاڑیوں کی شکل اور رفتار کیا ہے اور کچھ نہیں تو وہ اتنا تو جانتا ہے کہ کپاس کی سنڈی کی شکل کیسی ہوتی ہے اور اُسے کس طرح مارا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں بچہ دیکھتا اور سنتا رہتا ہے اور قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔ اسی طرح علم میں وسعت ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس پہ نوجوان سوچتے ہیں کہ یہ بڑے بوڑھے جو ہم پہ طنز کرتے ہیں اور خواہ مخواہ ہماری پگڑی اچھالتے ہیں (اب تو سر پہ ٹوپی بھی نہیں رہی۔ یہ محاورہ بھی تو بڑے بوڑھوں کی ایجاد ہے) وہ ذرا اپنے بچپن پہ تو نگاہ دوڑائیں۔ کیا وہ اتنا کچھ جانتے تھے جو آج ہم جانتے ہیں تو پھر معیارِ تعلیم گرنے کا رونا کیوں؟

یہ ہوئے دو نقطہ ہائے نظر۔ بحث کے دو پہلو۔ مگر کسی بحث کو نمٹانے کے لئے ٹھوس حقائق چاہئیں۔ اسلئے آئیے آج حقائق کی روشنی میں اسی مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ طلباء کی قابلیت اور لیاقت ناپنے کا ایک ہی پیمانہ دریافت ہوا ہے۔ یعنی امتحان۔ اس میں بیسیوں نہیں سینکڑوں نقائص ہیں اور ہر روز امتحانات غیر معیاری اور ناقابل اعتبار ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر کسی بہتر پیمانہ کی عدم موجودگی میں انہیں پہ انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے آئیے دیکھیں کہ امتحانوں کے نتائج کیا تصویر پیش کرتے ہیں:

راقم نے کچھ عرصہ قبل ایک سٹڈی کی جس میں لاہور بورڈ کے بائیس سال قبل کے نتائج کا موجودہ نتائج سے موازنہ کیا۔ اس ریسرچ میں کئی باتیں نمایاں ہوئیں۔ سب کے ذکر کی تو گنجائش نہیں چند متعلقہ حقائق قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

میٹرک کے امتحان میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک کے نتائج ۵۱٫۳، ۵۷٫۱، ۵۵٫۹، ۵۸٫۵ اور ۵۸٫۲ فی صد تھے جیسا کہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک ۵۳٫۵، ۵۳٫۳، ۵۶٫۰، ۶۲٫۱ اور ۵۸٫۹ فی صد تھے۔ گویا کہ بائیس سال قبل کے اوسط نتائج ۵۶٫۲ فی صد تھے جیسا کہ بائیس سال بعد ۵۶٫۸ فی صد تھے۔ گویا کوئی زیادہ فرق تو نہیں لیکن بہر حال تھوڑی سی ترقی ضرور ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے نتائج انہی سالوں کے کچھ یوں تھے۔ پہلے دور میں ۳۲٫۴ - ۳۸٫۹ - ۴۲٫۷ - ۳۸٫۲ - ۳۲٫۳ اور دوسرے دور میں ۲۶٫۸ - ۲۵٫۹ - ۳۴٫۴ - ۳۰٫۳ - ۳۰٫۲ تھے۔ یہاں پہلی ۳۶٫۹ کی اوسط کے مقابلہ میں دوسرے دور میں اوسط ۲۹٫۵ فی صد رہ گئی۔ یہاں یقیناً تنزل نظر آتا ہے۔ معیار یقیناً گر گیا۔ لیکن معیار کے گرنے یا بڑھنے کا نتیجہ نکالتے وقت مختلف امتحانی پہلوؤں کو بھی مدِ نظر رکھنا پڑے گا۔ ان بظاہر کم بہتر نتائج کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج کے طالب علم امتحان دو قسطوں میں دیتے ہیں۔ یعنی سالانہ امتحان میں تین چار مضامین سے نبرد آزما ہو گئے اور باقی سے سپلیمنٹری میں دو دو ہاتھ کئے۔ یہ طریق اس لئے اپنایا جاتا ہے تا مجموعی نمبر زیادہ ہو جائیں اور میڈیکل یا انجنیئرنگ میں داخلہ کا امکان ہو سکے۔ مگر نتائج مرتب کرتے وقت ان طلباء کو جو چند مضامین میں شریک ہوئے اور باقی میں غیر حاضر رہے فیل قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح پاس ہونے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور نتائج کی فی صد متاثر ہو جاتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اوپر دیئے گئے اعداد و شمار بھی صحیح تصویر کشی نہیں کرتے۔

اب ایک اور جہت سے ان نتائج پہ نظر ڈالئے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے ۱۶٫۶ سے ۲۳٫۱ فی صد تھے جیسا کہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک یہ فی صد ۱۹٫۸ سے ۲۵٫۶ تھی گویا بہتر نمبر حاصل کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ یہ ایک خوشکن امر ہے جو نتائج کے بہتر ہونے کی نشاندھی کرتا ہے اسی طرح انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی صورتِ حال یہ تھی کہ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے ۵٫۸ اور ۷٫۹ فی صد تھے جب کہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء میں ۱۶٫۶ سے ۲۱٫۹ طلباء نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ نتائج یقیناً بہتر ہوئے بلکہ بہت بہتر۔ کیونکہ ان اعداد و شمار سے پتہ چل رہا ہے کہ قابل طلباء کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اسی کو ایک اور جہت سے دیکھا جا سکتا ہے کہ دونوں ادوار میں زیادہ سے زیادہ کتنے نمبر حاصل کئے گئے میٹرک میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک ۸۶٫۲ سے ۹۰٫۱ فی صد تک نمبر حاصل کئے گئے جب کہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک یہ فی صد کسی سال بھی ۹۲ سے کم نہیں رہی اور زیادہ سے زیادہ ۹۳٫۵ نمبر حاصل کئے گئے اور یہاں بھی نمایاں بہتری نظر آتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ میں فرق اتنا نمایاں تو نہیں لیکن پھر بھی دوسرے دور میں پہلے سے نمبروں کی فی صد بڑھ گئی اور یہ بھی ترقی کی طرف نشاندہی ہے۔

اوپر دیئے گئے حقائق سے ایک بات واضح ہو رہی ہے یعنی فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور طلباء پہلے سے کہیں زیادہ نمبر حاصل کر رہے ہیں۔ یہ دونوں باتیں نشاندھی کر رہی ہیں کہ ہم آج پہلے سے بہتر نتائج پیش کر رہے ہیں۔ گویا ترقی کی طرف گامزن ہیں۔ لیکن اگر اس نتیجہ کو حتمی قرار دیا جائے تو کئی انگلیاں اٹھیں گی۔ کئی آوازیں اس کے خلاف بلند ہوں گی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اشیائے اکل و شرب میں ملاوٹ کی طرح اب امتحانی نمبروں میں بھی ملاوٹ کی فی صد اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان پر سے اعتماد اُٹھتا جا رہا ہے اور نتائج مشکوک ہوتے جا رہے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ بورڈ اس بات کا بھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کونسا بچہ بورڈ میں فرسٹ آیا ہے اور کونسا دوسرے نمبر پہ۔ کبھی ایک نام کو اُچھالا جاتا ہے اور کبھی دُوسرا اس کے سر پہ سوار کر دیا جاتا ہے۔ اگر بورڈ خود ڈانواں ڈول ہوں۔ اگر وہ خود ردّ و بدل میں ملوث ہو کر اپنی ساکھ کو نقصان پہنچا رہے ہوں اور نتائج کے حتمی اور قابلِ اعتبار ہونے کی نفی کر رہے ہوں تو پھر معیار کہاں سے ڈھونڈا جائے۔ کون ہمیں بتلائے گا کہ ہمارے طلباء کی تعلیمی قابلیت کیسی ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ نمبروں کے حصول کے لئے ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور اس کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ نتیجتاً نمبر اس وافر انداز میں مل رہے ہیں کہ آج الیکٹریکل انجنیئرنگ کے داخلہ کے لئے وہ طالب علم جس جس نے عرق ریزی کر کے

باقی صٓ پہ

Digitized by Khilafat Library Rabwah

ہماری تاریخ

ربوہ کے پہلے تاریخی جلسہ سالانہ کے تمام انتظامات حضرت قاضی محمد عبداللہ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ناظر ضیافت کے سپرد تھے اور حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد صاحب ایم اے اور میاں عبدالمنان صاحب عمر ایم اے آپکے نائب اور مولوی محمد شفیع صاحب اشرف واقف زندگی انچارج دفتر کے فرائض بجا لاتے رہے۔

نظامت سپلائی کے انچارج جناب قاری محمد امین صاحب تھے۔ اور جلسہ کے انتظامات کے متعلق تمام اشیاء کی فراہمی کا انتظام آپ کے سپرد تھا۔ نظامت سٹور کے انچارج عبدالوحید خان صاحب تھے۔

مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست ناظم جلسہ کی حیثیت سے حضرت سید محمود اللہ شاہ صاحب بی اے بی ٹی ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ذمہ تھا۔ آپ کے نائبین صوفی محمد ابراہیم صاحب صوفی غلام محمد صاحب ماسٹر ابراہیم صاحب بی اے۔ ماسٹر ابراہیم صاحب ناصر تھے۔ چوہدری حبیب احمد صاحب سیال معاون ناظر ضیافت تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے انتہائی بے سروسامانی اور مشکلات کے ہجوم میں اپنے نائبین کے ساتھ عمدہ طور پر اپنی ذمہ داری ادا کی۔ مہمانوں کی خدمت کے لئے ۳۰۰ کے قریب محکمے اس نظامت کی نگرانی میں کام کر رہے تھے۔ مثلاً شعبہ روشنی۔ شعبہ صفائی۔ شعبہ استقبال۔ شعبہ مہمان نوازی جسکے انچارج بالترتیب چوہدری عبدالباری صاحب، چوہدری عبدالسلام صاحب اختر ایم اے، چوہدری صلاح الدین صاحب بی اے اور مولانا ابوالعطا صاحب و چوہدری عبدالرحمن صاحب بی اے بی ٹی تھے۔

کھانا وغیرہ لنگر خانہ کے منتظم صوفی غلام محمد صاحب نائب ناظم جلسہ کی نگرانی میں تیار ہوتا تھا۔ دن رات چالیس تنور گرم رہے اور ایک ایک وقت میں ساٹھ ساٹھ دیگیں سالن وغیرہ کی تیار ہوتی تھیں۔ معزز مہمانوں کی آمد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اور کام کرنے والوں کی تعداد کا ہر اندازہ غلط ہوتا رہا اسلئے کارکنوں کی محدود تعداد پر ہی کام کا بوجھ پڑ رہا تھا۔ اس کوشش میں کہ تمام مہمانوں کو کھانا پہنچ جائے اس محدود عملہ سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جس کے نتیجے میں نان پز اور باورچی بے ہوش ہو ہو جاتے تھے۔ اور دوسرے عملے کو بھی بعض اوقات بیس بیس گھنٹے کام کرنا پڑا۔

حضرت امام جماعت (الثانی) کی تحریک کے مطابق بہت سے احباب اپنے ہمراہ گندم، آٹا اور دالیں وغیرہ لے کر آئے تھے۔ بعض دوست تو کئی بوریاں گندم کی لائے۔ چنانچہ مہمانوں کی خوراک کے لئے گندم کا کافی ذخیرہ ہو گیا تھا۔ اور باوجود مہمانوں کی کثرت کے گندم کی قطعاً قلت محسوس نہ ہوئی۔

ایک پہاڑی کے دامن میں لنگر خانہ قائم کیا گیا تھا۔ جہاں تمام مہمانوں کے لئے کھانا تیار ہوتا تھا۔ اس جگہ ۴۵ تنور لگائے گئے تھے چونکہ لنگر خانہ مہمانوں کی قیام گاہ سے دور ہٹ کر تھا اسلئے پانچ ٹرک قیام گاہوں تک کھانا لانے کے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے۔ جب کھانا قیام گاہوں تک پہنچتا تو اسے جماعت وار تقسیم کر دیا جاتا۔ ہر جماعت کے لئے الگ الگ کارکن مقرر تھے جو کھانا کھلانے کی خدمت سرانجام دیتے کارکنان کی کمی ان کی ناتجربہ کاری نئی جگہ اور نئے حالات کی وجہ سے انتظامات میں دقتوں کا پیدا ہونا تو لازمی تھا۔ لیکن امید سے بڑھ کر مہمان آنے کی وجہ سے مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ جسکی وجہ سے کھانا وقت پر نہ ملنے یا ناکافی ملنے کی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن احباب کو چونکہ مشکلات کا علم تھا اس لئے وہ نہایت خندہ پیشانی سے یہ تکلیف برداشت کرتے رہے۔

مہمانوں کی رہائش کے لئے سٹیشن کے دونوں طرف پچاس نئی اور عارضی اور کچی بیرکیں تعمیر کی گئی تھیں۔ شعبہ تعمیرات کے انچارج مکرم ملک محمد خورشید صاحب تھے۔ جنہوں نے اپنے نائبین چوہدری عبداللطیف صاحب اور راجہ محمد نواز صاحب کی امداد سے نہایت تنگ وقت میں کام سرانجام دیا۔ مستورات کی بیرکوں کے گرد اگرد ایک اونچی دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ جس سے پردے کا پورا پورا اہتمام تھا۔ خواتین کے لئے دس بیرکیں مخصوص کی گئی تھیں۔ لیکن محدود ۱۴ اپریل کی رات کو اتنی تعداد میں مستورات آگئیں کہ وہ جگہ ان کے لئے قطعاً ناکافی ثابت ہوئی۔ اسکی دیوار توڑ کر قریب کی دو بیرکیں بھی مستورات کو دے دی گئیں۔ ان بیرکوں کے علاوہ احباب کی ایک معقول تعداد اپنے ساتھ چھولداریاں اور خیمے لائی ہوئی تھی۔ جنکے نصب کرنے کے لئے ایک مخصوص جگہ مقرر کر دی گئی تھی اور جس سے میدان ربوہ میدان......

......کی بارونق تھا۔ جلسہ میں کسیر وغیرہ کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے نیچے بچھانے کے لئے کھجور کی بنی ہوئی چٹائیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

ربوہ میں سولہ سترہ ہزار نفوس کے لئے پانی کا مہیا کرنا ایک بڑا مشکل مرحلہ تھا اس اجتماع میں صرف لنگر خانہ میں پانی کا روزانہ خرچ سات ہزار گیلن تھا بہرحال خدا تعالےٰ کے فضل سے ان تمام مشکلات پر قابو پالیا گیا۔ اس سلسلہ میں ربوہ میں ہانبیس نلکے لگائے گئے اور ٹینکروں کے ذریعے ربوہ سے باہر ساڑھے سات میل کے فاصلے سے پانی کے منگوانے کا انتظام کیا گیا۔ اسی طرح تقریباً اٹھائیس ہزار گیلن پانی روزانہ مہیا ہوتا رہا۔ گورنمنٹ نے چار ٹینکر مع ضروری سٹاف کے یہاں بھجوائے۔ پانی کے سٹاک کے لئے چھوٹی چھوٹی آہنی ٹینکیوں کا انتظام تھا۔ اور وہ مناسب جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ جیساکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس شعبہ کے منتظم چوہدری عبدالباری صاحب بی اے نائب ناظر مال تھے۔ جنہوں نے نہایت تندہی سے اس کام کو سرانجام دیا۔

قادیان میں تو ہزاروں ہزار تربیت یافتہ کارکن میسر آجاتے تھے۔ لیکن یہاں مقامی کارکن تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ اسلئے بیشتر کارکن خود مہمانوں پر ہی مشتمل تھے۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ۔ جامعہ احمدیہ مدرسہ احمدیہ کے قابل احترام اساتذہ اور جوان طلباء نے انتظامات میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جلسہ مستورات کے انتظامات کے لئے سلسلہ میں خاندان حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی مستورات قابل رشک حد تک سرگرم عمل رہیں۔ بہت سی دیگر مہمان خواتین نے بھی ان کا نہایت اخلاص سے ہاتھ بٹایا۔ خواتین کا انتظام ایسا عمدہ تھا کہ خود سیدنا حضرت فضل عمر نے اسکی بہت تعریف فرمائی۔

جلسہ سالانہ کے دو دن پہلے ہی شمع احمدیت کے پروانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے توقع سے زیادہ تعداد جلسہ میں شامل ہوئی۔ باوجود اسکے کہ فصل کی کٹائی کا موسم تھا پھر بھی دیہاتی جماعتوں کے احباب کثرت سے آئے۔ جلسہ میں نہ صرف پنجاب کے ہی احباب شامل ہوئے بلکہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے ہر صوبے کے احمدی دوست آئے۔ اس طرح پاکستان کے علاوہ قادیان بہار کلکتہ اور حیدر آباد سے بھی دوست تشریف لائے۔

بقیہ: ص ۳ سے آگے

ہوتی ہے کہ رات کی تاریکی سایہ ڈالے ہوئے ہوتی ہے۔ اور مصیبت زدہ بندہ اپنے لحاف میں پڑا آہیں بھر رہا ہوتا ہے۔ اور دنیا کا کوئی فرد نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یا کیا کہہ رہا ہے۔ کوئی افسر اسے فریاد کرنے سے روک نہیں سکتا۔ وہ لحاف میں لیٹے لیٹے خدا تعالیٰ کے دربار میں اپنی آواز بلند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا! فلاں نے مجھ پر ظلم کیا ہے تو میری طرف سے آپ اس کا بدلہ لے۔ ظالم نہیں جانتا کہ اسکے خلاف بادشاہ تک شکایت پہنچ چکی ہے۔ وہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ نہ اسکے دل میں کوئی خیال گذرتا ہے۔ پس جب انسان خدا تعالیٰ کے حضور مضطر ہو کر فریاد کرتا ہے۔ جب کوئی اس کے پاس نہیں ہوتا تو اس وقت کون اس کی مدد کے لئے آتا ہے دنیا غافل ہوتی ہے۔ مگر خدا اپنے بندہ کی مدد سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ خود آتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اے میرے بندے میں تیری مدد کے لئے آگیا ہوں۔ اور پھر وہ اس سے ایسی محبت اور پیار کا سلوک کرتا ہے کہ اس کا ہر دکھ دور ہو جاتا ہے۔

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں۔

"انسان کو چاہیئے کہ ہمیشہ دعائیں لگا رہے اور اپنے اندر پاک تبدیلی پیدا کرنے کی سچی تڑپ اور سچی خواہش پیدا کرے اور خدا تعالیٰ کی محبت کی پیاس دل میں پیدا کرے تاکہ پھر خدا تعالیٰ کا فیضان بھی اس کی نصرت کرے اور اسے قدرت نمائی سے دکھائے۔"

Digitized by Khilafat Library Rabwah

متمدن یورپ

پچھلے چند ماہ سے برطانوی اخبارات میں وہ ظالمانہ طریقے موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعہ مختلف جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں یہ مناظر عام ہیں کہ ہلاک شدہ ایک سالم پولٹی ہک سے ٹنگا ہوا ہے اور دوسرے گھوڑے اور جانور پاس ہی کھڑے اپنے ہلاک کئے جانے کے منتظر ہیں اگر آپ گوشت لینے جائیں تو دکاندار آپ سے یہ ضرور پوچھے گا کہ آپ اپنے جانور کو چھری سے ذبح کرانا پسند کریں گے یا کرنٹ کرانا آپ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جانور کو گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ یورپ میں جانوروں کو دور دراز کے فارموں سے شہروں اور قصبوں میں منتقل کرنے کے لئے جو ٹرینیں استعمال کی جاتی ہیں ان میں ہزاروں جانوروں کو جگہ اور سانس لینے کی سہولت کا خیال رکھے بغیر ٹھونس دیا جاتا ہے۔ ۲۴ گھنٹوں کے سفر کے دوران جانوروں کو کھانے پینے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ روایت پسند برطانوی جو دنیا میں جانوروں سے محبت کے معاملے میں سب سے زیادہ حساس سمجھے جاتے ہیں اس صورتحال سے بہت کبیدہ خاطر ہیں۔ برطانوی وزارت زراعت کے پارلیمنٹری سیکرٹری نے طنزیہ کہا کہ یہ ہمارا کلچر ہے! اگرچہ برطانیہ میں انسداد بے رحمی جانوروں کے قوانین بڑے سخت ہیں تاہم باقی یورپ میں ان قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں جانوروں کے حقوق کی علمبردار تنظیموں نے نے پچھلے ہفتے ایک یادداشت جس پر پچاس ہزار افراد کے دستخط تھے ڈاؤننگ سٹریٹ میں پیش کی اور مطالبہ کیا کہ جانوروں کی بہبود کے قوانین کی پابندی کی جائے۔ اس وقت یورپ کے مذبح خانوں میں جانوروں کو نہایت سنگدلی سے مختلف طریقوں سے ہلاک کیا جاتا ہے۔ جانوروں کی بہبود کا ادارہ آر ایس پی سی اے نہ صرف ان طریقوں میں بہتری کے لئے کوشش کر رہا ہے بلکہ اس کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ جانوروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہوئے ہر آٹھ گھنٹے بعد وقفہ دیا جائے لیکن یورپ کے بہت سے تجارتی حلقوں کا خیال ہے کہ آر ایس پی سی اے کی سفارشات پر عمل کرنے سے کاروبار پر منفی اثر پڑے گا اور جانوروں کی فوری ترسیل مشکل ہو جائے گی۔ پچھلے دنوں آر ایس پی سی اے نے سپین کے مذبح خانوں سے متعلق ایک فلم دکھائی جس میں جانوروں کو بجلی کے جھٹکوں سے بے ہوش کئے بغیر براہ راست ہلاک ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ جانوروں سے ہمدردی رکھنے والے یورپ کے باشندوں کا خیال ہے کہ یورپ کو بالآخر سبزی خور بر اعظم بننا ہوگا۔

(روزنامہ پاکستان لاہور۔ ۱۲ اگست ۱۹۹۱ء)

آپ کا خط ملا

مکرم مولوی بشیر احمد صاحب قمر فجی سے لکھتے ہیں

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ خدمت کرنے والی لمبی زندگی بخشے دنیا کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے وطن عزیز کے حالات کا صحیح علم تو نہیں کبھی کبھی دنیا کے کسی نہ کسی گوشہ سے اس کا پیارا نام سننے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ لیکن خوشی کی خبریں نہیں ہوتیں۔ روزنامہ الفضل میں جس محبت سے آپ علمی مضامین ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے لئے بہت ہی ممنون ہیں۔ اگرچہ اس کے بعض پرچے مہینوں آگے پیچھے ہو کر ملتے ہیں۔ تاہم آپ نے جو ملکی و غیر ملکی خبروں کا کالم شروع کیا ہوا ہے بہت مفید ہے اور دعاؤں کا محرک بھی ہوتا ہے۔

گذشتہ دنوں علامہ ابوالکلام آزاد صاحب کی کتاب "ہجر و وصال" زیر مطالعہ تھی جو ادارہ اسلامیات ہے جے نے سرفراز پریس لکھنؤ سے شائع کی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات پڑھ کر تحریک ہوئی کہ آپ کو بھی لکھ دوں۔ شاید کسی سوچنے والے کے لئے مفید ہو سکیں۔ جملہ کارکنان کو سلام و دعا۔

(اقتباسات مل گئے ہیں۔ کسی مناسب موقع پر شائع کر دئے جائیں گے ـــــ ادارہ)

"استغفار بہت پڑھا کرو۔ انسان کے واسطے غموں سے سُبک ہونے کے واسطے یہ طریق ہے۔ نیز استغفار کلید ترقیات ہے۔"
(حضرت بانی سلسلہ)

میرے تصور کا پاکستان

شاہدہ ندیم

(یہ مضمون طلوع اسلام کنونشن مارچ ۱۹۹۱ء میں اوّل انعام کا مستحق قرار پایا)۔

؎ اے وطن یہ تیرا اترا ہوا چہرہ کیوں ہے
غرفہ و بام شبستاں میں اندھیرا کیوں ہے؟
درد پلکوں سے لہو بن کے چھلکتا کیوں ہے
ہر اک سانس پہ تنقید کا پہرہ کیوں ہے؟
کس نے ماں باپ کی سی آنکھ اٹھالی تجھ سے
چھین لی کس نے تیرے کان کی بالی تجھ سے؟

تصور اور حقیقت ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ تصور کی بنیاد پر حقائق کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لیکن کسی قوم کے لئے وہ وقت لمحۂ فکریہ ہوتا ہے۔ جب وہ سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کے کسی ایک مخصوص رُخ کو متعین نہ کر سکے کسی ایک تصور پر متفق نہ ہو۔ کسی ایک جہت پر یکجا نہ ہو۔ کسی ایک رنگ سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہی کثیر جہتی یہی متنوع خیالی پاکستانی قوم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اور یہی وہ تلخ حقیقت ہے جس کے ادراک نے مجھے ان مشترک عناصر کی تلاش پر مجبور کیا جو ساری قوم کے جذبوں کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافت اور ہمارے اسلاف کی خواہشات کے امین بھی ہوں۔ ان عناصر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد میرے ذہن نے پاکستان کا ایک تصور تراشا۔ اس تصور کو حقیقت کے تناظر سے دیکھا تو اذیت کے جس جانگداز مرحلے سے مجھے گذرنا پڑا اس کا ذکر خوف طوالت کے پیش نظر ترک کرتی ہوں

؎ وہاں ساحلوں پہ بشارتوں کا چراغ بھی ہے جلا ہوا
یہاں ہاتھ میرے بندھے ہوئے مرا بادبان چھدا ہوا

میرے ذہن میں ایک ایسے پاکستان کا تصور ابھرا ہے۔ جسے بنانے کی سعی ہمارے بزرگوں نے کی۔ جس کا تصور لٹی ہوئی عصمتوں کے رقص پر ہماری بہنوں نے کیا۔ میرے خیال میں پیرس اور سوئٹزرلینڈ کی جنت نہیں بلکہ مٹی اور گوبر اور دھول سے اٹا ہوا، وہ پاکستان ابھرا جس کا حرف حرف ہمارے قائد کی کتاب دل پہ لکھا ہوا تھا۔ آئیے! بھیانک حقیقتوں کے تناظر میں پاکستان کے سیاسی، معاشی، سماجی روحانی اور اخلاقی نظام کے متعلق اپنے تصور کے دھنک رنگ آپ کو دکھاؤں

سب سے پہلے سیاسی نظام کی طرف آئیے۔

پاکستان کا سیاسی نظام ہمارے حکمرانوں کے مفادات کے خام مال سے تیار ہونے والا ایسا کمزور ڈھانچہ ہے جو نئے موسم کی پہلی بارش میں دھڑام سے گر جاتا ہے۔ اور پھر کوئی نیا طالع آزما ملبے کے ڈھیر سے اپنے اغراض کے سنگ ریزے چن کر ایک نئی عمارت تعمیر شروع کرتا ہے۔ اور مفاد پرستوں کا ایک ہجوم اسکے گرد جمع ہو کر تالیاں بجاتا ہے۔ اور میرا ذہن سوچوں کی جنت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

میرے تصور میں ایک ایسے پاکستان کا تصور ابھرتا ہے جس کے سیاسی نظام کی بنیاد ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے دھندلے نقوش پر نہیں بلکہ فاران کی چوٹیوں سے اترنے والی صداقت ازلی پر رکھی گئی ہے۔ جہاں قال اللہ و قال الرسول کا نام ہے کہ اقتدار پر نہیں مرا جاتا۔ جہاں روٹی، کپڑا اور مکان کے کھوکھلے نعروں سے عوام کا پیٹ نہیں بھرا جاتا۔ جہاں اسلامی جمہوریت ہے۔ جہاں کسی آمر کو پریس اینڈ پبلی کیشن ایکٹ جاری کرنے کی جرأت نہیں۔ جہاں شورائیت کا حقیقی تصور موجود ہے۔ جہاں احتساب ہے۔ مگر انتقام نہیں، جہاں اپوزیشن کو اظہار خیال کا موقع ملتا ہے۔ جہاں سیاست ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے دامن کی گندگی کو دھونے اور دوسروں کے عیوب کی اصلاح کا عمل ہے کہ قائد اعظم نے فرمایا تھا:۔

"ہم نے پاکستان کی جنگ آزادی جیت لی ہے مگر اسے برقرار رکھنے اور مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی سنگین ترین جنگ ابھی جاری ہے اب آپ کو اپنے ہی وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرہ عدل اور مساوات انسانی کے اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے۔"

(افواج پاکستان سے خطاب ۲۱ فروری ۱۹۴۷ء)

اب معاشی نظام کی طرف آتے ہیں۔ پاکستان معاشی اور اقتصادی لحاظ سے دیوالیہ ہو چکا ہے ہم ورلڈ بینک کنسورشیم اور ایشیائی بینک کے قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ آئی ایم ایف کے مطالبات مانتے مانتے ہماری معیشت کے جسم میں سودی کینسر ہو گیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان ۱۵٫۶ ارب ڈالر کا مقروض ہے۔ سود کی رقم ۵۵ ارب روپے سالانہ تک پہنچ گئی ہے۔ دولت وسیلۂ حیات نہیں مقصد حیات بن گئی ہے۔ پوری قوم لاٹری اور انعام کے طلسم میں گرفتار ہے۔

میرے تصور کا پاکستان ایسا نہیں، میرے تصور کا پاکستان تو ایک ایسے معاشی نظام کا حامل ہے۔ جسکی جڑیں اسلام کے معاشی اصولوں میں پیوست ہیں۔ جہاں نظام زکوٰۃ بھی ہے اور نظام صدقات بھی۔ جہاں قانون میراث بھی ہے اور نظام وصیت بھی، جہاں قرض دینے کی ترغیب بھی دلائی جاتی ہے۔ اور درست ناپ تول کا اہتمام بھی جہاں قدر محنت بھی ہے اور قانون شفعہ بھی۔ جہاں حکومت کی محدود

Digitized by Khilafat Library Rabwah

مداخلت بھی ہے اور ذاتی ملکیت کی اجازت بھی جہاں ارتکاز زر کی مخالفت بھی ہے اور عاریت کا تصور بھی جہاں حلال و حرام کی حدود بھی ہیں اور اقتصادی کاوش کی اجازت بھی جہاں نوجوانوں کو اداسیاں اوڑھے گھنٹوں عرضیاں پکڑ کر دفتروں کے باہر کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ جہاں کالے دھن کی خاطر کالے دھندے کی گرم بازاری نہیں ہے۔ جہاں خود انحصاری کا نام نہیں لیا جاتا۔ خود انحصاری کے لئے کام کیا جاتا ہے۔ جہاں معاشی ضروریات کے لئے اپنی جبینیں امریکہ اور سعودی عرب کے آگے رگڑنے کی بجائے، خدائے واحد کے سامنے جھکا جاتا ہے۔ کہ قائد اعظم نے فرمایا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی تجارت، کاروباری دیانت کے اعلیٰ معیار قائم کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا کی تجارتی منڈیوں میں لفظ پاکستان، مال کی عمدگی اور اعلیٰ معیار کا مترادف ہو جائے"

(ایوانِ تجارت کراچی سے خطاب ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء)

اب پاکستان کے عدالتی نظام کی طرف آئیے۔ ہمارا عدالتی نظام مہنگا، سست اور پیچیدہ ہے۔ سچ کے چہرے پر کالک مل جاتی ہے اور جھوٹ پجارو میں بیٹھ کر اپنے عشرت کدے میں پناہ لے لیتا ہے۔ شریف شہری ظلم کے خلاف عدالتوں میں مقدمہ درج کرانے سے گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ گھر بار اور عزت بیچ کر بھی یقین نہیں آتا کہ انصاف مل جائے گا۔

مگر اپنے قائد کی طرح میرے ذہن میں ایک ایسی پاک دھرتی کا تصور ہے۔ جہاں عدل و انصاف کا تصور عملیت کا جامہ پہن چکا ہے۔ جہاں ارشادِ خداوندی "انصاف کے قائم کرنے والے بن کر خدا کے آگے گواہ بنو" (۴: ۱۳۵) پر لبیک کہا جاتا ہے۔ جہاں گواہوں کو خریدا نہیں جاتا ہے جہاں عدالتوں میں تاریخیں مٹھی گرم کئے بغیر حاصل کی جاتی ہیں۔ جہاں انصاف کے حصول کے لئے اپنی قیمت نہیں لگانی پڑتی۔ جہاں یہ تک کہہ دیا جاتا ہے کہ "خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اسکے ہاتھ کاٹ دیتا"۔ جہاں تمیزِ بندہ و آقا کو فسادِ آدمیت سمجھا جاتا ہے۔

ے اب اندھیروں میں چراغاں ہوں گے
ہم سویروں کے نگہباں ہوں گے
شب کے اجزاء جو پریشاں ہوں گے
کتنے خورشید درخشاں ہوں گے۔

اب معاشرتی و ادبی سطح پر آئیے۔ ہمارا سماج مختلف قومیتوں میں بٹ چکا ہے۔ معاشرتی و ادبی سطح پر ثنویت کا تضاد ہے۔ جس نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ پاکستان ہماری آرزوں کا کعبہ ہے۔ اسکے وجود میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی عظیم روایات کے سہارے ایک نئی تہذیبی قوت بن کر ابھریں۔ مگر سارا معاشرہ اسلام کے عظیم اصولوں۔ پاکستان کے حسین آدرش کے باوجود تنگ نظری، تعصب، علاقہ واریت اور تقلیدانہ ذہنیت کا شکار ہو چکا ہے۔ پاکستانی معاشرہ غیر آسودہ خواہشات کا معاشرہ۔ وسائل اور خواہشات اور قول اور عمل کے مابین تضاد بڑھتا جا رہا ہے ثنویت کے اسی تضاد نے ہر سطح پر ہمارے تخلیقی سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ فراریت اور خود فراموشی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ہمارے بچے اچھے لباس اور تعلیم سے محروم ہیں ہیروازم کے تصور نے معاشرے کو تھکن سے چور کر دیا ہے۔

ے ہر نفس میں شعلہ زن ہیں گرمیاں حالات کی
زندگی ہے ان دنوں بے موت مر جانے کا نام

پاکستانی معاشرے کی اس حالت کو دیکھ کر میرے تصور کی آنکھ میں آنسوؤں کی نمی تیر رہی ہے اور میرے سامنے ایک اور معاشرے کا تصور ابھر رہا ہے۔ یہ وہ پاکستانی معاشرہ ہے۔ جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہاں سچ، امانت داری، تہذیب، شجاعت صداقت، محنت اور یکجہتی کا گہرا احساس موجود ہے جہاں پولیس، واپڈا، کسٹم، انکم ٹیکس اور تعلیم و صحت کے محکمے اپنے فرائض امانت داری سے سرانجام دیتے ہیں۔ جہاں ادب برائے زندگی کے ساتھ ساتھ ادب برائے پاکستان اور ادب برائے اسلام کا تصور بھی موجود ہے۔ جہاں عروس البلاد کراچی اور سرزمین سندھ میں امن اور آشتی کے پھول کھلتے ہیں۔ جہاں جھنگ کا شہر فرقہ واریت کی نذر نہیں ہوتا۔ جہاں قومیت پسندوں کو اپنی پارٹی کا وزن نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ ان کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ جہاں سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان سب ایک ہیں۔ کہ قائد اعظم نے فرمایا تھا۔

" آپ کو چاہیئے کہ بنگالی، سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ کی باتیں نہ کریں۔ آپ سب ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے ایک سلطنت اپنے لئے بنائی ہے۔ ایک وسیع و عریض سلطنت۔ یہ آپ سب کی ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ سندھی کی، نہ پٹھان کی۔ یہ آپ کی ہے"

(ڈھاکہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء)

اب مذہبی اور اخلاقی سطح پر اگر پاکستان کا جائزہ لیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ مگر یہاں اسلام کو ایسی چیز سمجھا جانے لگا ہے۔ جس کا پالیسی اور پروگرام سے کوئی تعلق نہیں۔ مادیت کے ردِ عمل میں اسلام سے قوائے عقلیہ کو خارج قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلام کا رشتہ زندگی کے متنوع نظاموں سے کاٹ دیا گیا ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند کر کے اسلام کی آفاقیت کو داخلیت کے پنجرے میں مقید کر دیا گیا ہے۔ اور یہی حقیقت ہمارے سیاسی سماجی معاشی اور تعلیمی نظام کی وجہ زوال ہے۔

میرے ذہن میں ایک ایسے پاکستان کا تصور ہے۔ جہاں اسلام کی پاک تعلیم کا عملی نفاذ ہو۔ مادیت اور روحانیت کا صحت مند توازن ہو میرے ذہن میں ایک ایسے پاکستان کا خیال ہے جہاں مذہب زندگی کی نفی کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کے اثبات کا راستہ ہے جہاں اسلام کا رشتہ نامیاتی قوتوں سے کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ جہاں ہر نئی فکر سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اس کے صحت مند عناصر کو قبول کرنے کا رجحان موجود ہے۔ جہاں اسلام ایک فلسفۂ اخلاق ہی نہیں۔ زندگی کے عمل کا ارتقاء ہے۔ زندگی کی رنگارنگی میں توازن کا ذریعہ ہے جہاں مذہب اپنی جاندار شکل میں موجود ہے اور تصور و حقیقت، مادیت و روحانیت کے فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ کہ میرے قائد نے اسلام کے نفاذ کا خواب دیکھا تھا۔ ان کا فرمان ہے کہ

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔ جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں"

(شاہی دربار سبی بلوچستان میں تقریر ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء)

میرے تصور اور حقیقت کے درمیان فاصلے مٹانا ہمارا فرض اولین ہے۔ اگر یہ فاصلے مٹ جائیں تو پاکستان ایک مضبوط اور محکم قوت بن کر ابھر سکتا ہے۔ تب کسی امریکہ، کسی فرانس کسی اسرائیل کو جرأت نہ ہوگی کہ وہ ہمارے عراق کو کھنڈروں میں بدل دے۔ ہمارے سعودی عرب کے ساتھ کھیلیں اور ہمارے ترکی کے قرضے معاف کر کے اسے اپنے ہی بھائی کا گلا کاٹنے پر اکسائیں ہمارے افغانستان کو برباد کرنے کے منصوبے بنائیں پھر کوئی پاکستان کو خود انحصاری کی طرف قدم بڑھانے سے نہیں روک سکے گا۔ اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز پوری شان سے ہوگا۔

(خدا کرے ایسا ہی ہو)

بقیہ: صـ۴ سے آگے

۸۰ فی صدی نمبر حاصل کئے (جو یقیناً بہت اعلیٰ نمبر ہیں) وہ بھی حیران و ششدر رہے اور افسردگی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اتنے ڈھیر سارے نمبروں کے باوجود (جو نہ جانے اس نے خود لئے یا اس پر ہن کی طرح برس پڑے) وہ ابھی تک کھل جا سم سم کا راز نہیں پا سکا اور انجینئرنگ یونیورسٹی اس کے لئے اپنے در وا کرنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتی۔ الغرض مسئلہ گمبھیر سے گمبھیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ کدھر کو جا رہے ہیں کیا ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں یا تنزل کے گڑھے کی طرف لڑھک رہے ہیں کچھ بھی تو واضح نہیں۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے شاید ہم نے ترقی کر لی ہے لیکن اخلاقی اعتبار سے ہم رُو بہ تنزل ہیں اور اگر علم ہماری اخلاقی حالت نہیں سدھار سکتا تو وہ مار (سانپ) ہے جو ہمیں ڈستا چلا جا رہا ہے اور جس کا زہر ہمارے جسم و جاں میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ کھیل کب بند ہوگا۔ یہ عمل کب ختم ہوگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ مگر ہماری دعا تو یہی ہے کہ علم ہمارے قلوب کو منور کرے۔ ہماری آنکھوں کو نور عطا کرے اور ہماری روحوں کو جلا بخشے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

بقیہ: صـ۱ سے آگے

نے بتلائی ہے کہ اس نے ابیٰ اور استکبار کیا یعنی اس میں انکار اور تکبر تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اسلم کی تعمیل نہ کر سکا۔ اس وقت بہت لوگ ہیں کہ اس ابیٰ اور استکبار کی وجہ سے اسلم کی تعمیل سے محروم ہیں۔ کسی کو عقل پر تکبر ہے کسی کو علم پر۔ کسی کو اپنے بزرگوں پر جو کہ ان کے نقصان کا باعث ہو رہا ہے اور جب کبھی خدا کے مامور آتے رہے ہیں۔ انسان جب ایک دفعہ منہ سے نہ کر بیٹھتا ہے تو پھر اسے دوبارہ ماننا مشکل ہو جاتا ہے اور لوگوں سے شرم کی وجہ سے وہ اپنی ہٹ پر قائم رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ کھلم کھلا انکار اور آخرکار (اور وہ انکار کرنے والوں میں سے تھا) کا مصداق بننا پڑتا ہے۔ چونکہ مامورین الٰہی کا سلسلہ تو برابر انسانوں اور زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ہے اور اپنی قدیم سنت کے لحاظ سے خدا تعالیٰ نبی اور رسول مبعوث کرتے تھے۔ اس لئے قرآن شریف کے اول رکوع میں ہی تعلیم دی ہے کہ انسان کو انکار کا پہلو حتی الوسع اختیار ہی نہ کرنا چاہیئے۔"

(خطبہ عید الاضحیٰ فرمودہ ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء)

ذیابیطس میں گلوکوز کی مقدار بڑھنے کی چند اہم وجوہات

- دواؤں کے استعمال میں بداحتیاطی۔
- دواؤں کا ناقص ہونا۔ خاص طور پر انسولین کا ناقص ہونا۔
- خوراک میں بدپرہیزی۔
- مختلف اقسام کی انفیکشن، فالج اور ہارٹ اٹیک وغیرہ۔

Digitized by Khilafat Library Rabwah

دینی اور علمی باتیں کرنا اصلاح کا ذریعہ ہے

ارشادات سیدنا حضرت فضل عمر (اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ سے راضی رہے)

ایک اور ذریعہ اصلاح کا یہ بھی ہے کہ بیٹھ کر علمی اور دینی باتیں کی جائیں۔ اچھے انداز میں گفتگو کرنا بھی ایک خاص فن ہے ایسی مجلسوں میں علمی اور دینی باتیں ہوں۔ لیکن بحث مباحثہ نہ ہو۔ اس چیز کو بھی میں آوارگی سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ بات سب سے زیادہ دل پر زنگ لگانے والی ہے۔ مباحثہ کرنے والوں کے مدنظر تقویٰ نہیں بلکہ مد مقابل کو چپ کرانا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ مباحثات سے بچتا ہوں۔ اور میری تو یہ عادت ہے کہ اگر کوئی مباحثانہ رنگ میں سوال کرے تو ابتداء میں ایسا جواب دیتا ہوں کہ کئی لوگوں نے کہا ہے کہ انہوں نے کسی سوال پر پہلے پہل میرا جواب سن کر یہ خیال کیا کہ شاید میں جواب نہیں دے سکتا۔ اور در اصل ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں مگر جب کوئی پیچھے ہی پڑ جائے تو میں جواب کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے ایسا جواب دیتا ہوں کہ وہ بھی اپنی غلطی محسوس کر لیتا ہے۔ یاد رکھو کہ سچائی کے لئے کسی بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے ہمیشہ ایسی باتوں سے روکا ہے ڈیبیٹنگ کلبیں بھی میرے نزدیک آوارگی کی ایک شاخ ہے۔ اور میں اس سے ہمیشہ روکتا رہتا ہوں۔ لیکن یہ چیز بھی کچھ ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ برابر جاری ہے۔ حالانکہ اس سے دل پر سخت زنگ لگ جاتا ہے۔

تبدیلی نام

○ میں نے اپنا نام محمد زاہد ارشد ولد شیخ محمد ارشد ناصر کی بجائے رضوان احمد افضل ولد شیخ محمد ارشد ناصر رکھ لیا ہے۔ اب مجھے اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے۔

رضوان احمد افضل

دار العلوم غربی حلقہ (ثناء) ربوہ

تبدیلی دکان

پاک گولڈسمتھ گولبازار ربوہ

سے تبدیل ہو کر "طارق مارکیٹ" اقصیٰ روڈ پر آ گئی ہے۔ احباب نوٹ فرمالیں

عبدالمنان ناصر

ولد

میاں عبدالسلام صاحب

فون نمبر دکان: ۶۴۳-۵۵۰

فون نمبر گھر: ۵۴۹-۷۴۹

ملکی خبریں

○ جنرل آصف نواز جنجوعہ نے پاک فوج کی کمان سنبھال لی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے

○ بلدیاتی انتخابات کی آمد کے پیش نظر انتخابی فہرستوں پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ تاہم انتخابات پرانی فہرستوں کی بنیاد پر ہی ہوں گے۔ پرانی فہرستوں میں صرف مطلوبہ ناموں کا اضافہ کیا جائے گا۔

○ وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ میں ایک کنٹرول روم بنایا گیا ہے جو ضلعی سطح پر روزانہ کرائم کی رپورٹ پیش کرے گا۔ واضح رہے کہ وزیر اعظم کو خفیہ ایجنسیوں نے جرائم کی شرح زیادہ بتائی جب کہ وزارت داخلہ نے کم بتائی ہے۔

○ حبیب بنک اور یونائیٹڈ بنک جلد نجی شعبہ کو فروخت کر دیئے جائیں گے۔

○ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کہا ہے کہ پیپلز پارٹی پاکستان اور امریکہ کے درمیان قریبی تعلقات پر یقین رکھتی ہے۔

○ بی بی سی نے جنرل بیگ کی ریٹائرمنٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جنرل بیگ کی ریٹائرمنٹ سے حکومت کا خوف دور ہو گیا ہے نئے چیف آف آرمی سٹاف اور وزیر اعظم میں دوستی ہے۔

○ جنرل بیگ نے ریٹائرمنٹ کے موقع پر کہا کہ میں نیک نامی سے ساتھ فوج سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں نے قوم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

○ سندھ میں ڈاکوؤں نے ایک گاؤں پر حملہ کر کے ۴ افراد کو اغوا کر لیا ہے۔

○ راولپنڈی میں آئل فیلڈ میں آگ بھڑک اٹھی۔ آگ کی وجہ گیس کا اخراج تھا۔ تین جگہ سے ہونے والے اخراج میں سے دو جگہ سے اخراج روک دیا گیا ہے

○ امیر جماعت اسلامی نے کہا ہے کہ ہم حکومت کو چھوڑ چکے ہیں۔

○ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ امت مسلمہ پر عذاب کے سائے گہرے ہو رہے ہیں۔

○ بھارت نے آزاد کشمیر میں محدود جنگ چھیڑنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔

○ ربوہ کے نزدیک چناب کے پل پر پتھروں سے بھرا ٹرک ناقص پلیٹیں ٹوٹ جانے کی وجہ سے معلق ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ٹریفک جام ہو گئی۔ ٹریفک کی میلوں لمبی قطاریں لگ گئیں۔ شدید دھوپ اور گرمی کی وجہ سے مسافروں کو سخت پریشانی لاحق رہی۔

غیر ملکی خبریں

○ بھارتی ائرلائنز کا ایک طیارہ جس میں عملے سمیت ۶۹ افراد سوار تھے امفال ہوائی اڈے کے قریب ایک جھیل میں گر کر تباہ ہو گیا۔

○ سلامتی کونسل نے عراق کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کا تیل فروخت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ یہ ساری رقم اقوام متحدہ کے پاس جمع ہو گی عراق کو ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ اس رقم سے تاوان جنگ وصول کیا جائے گا اور عراقی لوگوں کے لئے کھانے پینے کے اشیاء خرید کر عراق کو دی جائیں گی۔

○ نیٹو ممالک کی بحری مشقیں ستمبر میں ختم ہوں گی۔

○ مقبوضہ کشمیر کے شہر سوپور میں خونریز جھڑپوں کے بعد شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ سوپور میں پہلے ہی سے کرفیو نافذ ہے۔ ان جھڑپوں میں کم از کم ۲۷ افراد ہلاک اور ۴۰ زخمی ہو گئے۔ یہ جھڑپیں اس وقت شروع ہوئیں جب کہ بھارت کے یوم آزادی کے موقع پر بھارتی پرچم کو کشمیریوں نے نذر آتش کر دیا۔ ان افراد کی شہادت کے خلاف دکانیں کاروباری ادارے بند رہے۔ سرکاری دفاتر میں حاضری برائے نام رہی بین الاضلاع ٹرانسپورٹ بھی بند رہی۔ مجموعی طور پر ایک دن میں وادی کشمیر میں ۴۰ افراد ہلاک ہوئے۔

○ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی تیل کمپنی کے اعلیٰ افسر مسٹر سوامی کو اغوا کرنے والے حریت پسندوں نے ان کو رہا کرنے کے لئے ایک نئی ڈیڈ لائن مقرر کی ہے۔ اس افسر کو ۵۰ دن قبل اغوا کیا گیا تھا۔ حریت پسندوں نے کہا ہے کہ اگر ہفتے کی شام تک ان کے دس ساتھیوں کو رہا نہ کیا گیا تو مسٹر سوامی کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ اس سے قبل بھارتی حکومت تین حریت پسندوں کو مسٹر سوامی کی رہائی کے لئے رہا کر چکی ہے۔

○ تہران میں سینکڑوں کشمیریوں نے مقبوضہ کشمیر کے حریت پسندوں کے حق میں مظاہرہ کیا۔

پتہ